اُردو میں فرضی مکتوب نگاری: نوعیت اور روایت

خالد ندیم

بعض ادبا نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے فرضی خطوط لکھے ہیں، جن میں کسی مکتوب کا جواب تو نہیں ہوتا، لیکن مکتوب نگار ایک مضمون تحریر کر دیتا ہے۔ یہ مضامین سنجیدہ تنقیدی تحریریں بھی ہو سکتی ہیں، خیالات و نظریات کا پرچار بھی، تاثراتی سطح کی ادبی تحریر بھی اور انشائیے بھی۔ یہ خطوط چوں کہ کسی کو بھیجنے کے لیے نہیں ہوتے، بلکہ انھیں اپنی موعودہ تصنیف کے لیے خام مال کے طور پر استعمال کرنا مقصود ہوتا ہے، چناں چہ انھیں فرضی مکتوب کہا جا سکتا ہے۔ ایسی تحریروں کو خطوط کا نام دینے کے لیے شروع میں مخاطب کر لیا جاتا ہے اور خط کے آخر میں مکتوب نویس اپنا نام لکھ دیتا ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کو منثور اور منظوم میں تقسیم کیا جاتا ہے، جب کہ اس میں فرضی مکتوب نگاری کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ یہاں لفظ 'فرضی' بعض غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ لفظ 'فرضی' سے مراد ایسے خطوط ہیں، جن کا مکتوب الیہ کوئی نہیں، بلکہ ان کا مقصد اپنے بعض خیالات کو کسی فرضی مکتوب الیہ کے نام خطوں کی صورت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ فرضی مکتوبات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اوّل، جن میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے بارے میں معلومات دستیاب ہوں، لیکن وہ خط مکتوب الیہ کو ارسال نہ کیے گئے ہیں، چناں چہ ایسے مکاتیب میں نہ تو کسی استفسار کا جواب ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی استفسار کیا جاتا ہے، بلکہ ایسے خطوط معلومات کی فراہمی تک محدود ہوتے ہیں۔ ان تحریروں کی نوعیت بنیادی طور پر رپورتاژ کی ہوتی ہے، جنھیں خطوط کا نام دے دیا جاتا ہے؛ مثال کے طور پر ابوالکلام آزاد نے دورانِ قید حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو مخاطب کر کے خطوط لکھے، لیکن پابندی کی وجہ سے انھیں اپنے پاس محفوظ کرتے رہے، یوں ان میں ابوالکلام آزاد کے شب و روز کی رُوداد رقم ہوتی رہی۔

دوم، پیروڈی کے تحت لکھے گئے خطوط، جن میں معروف ادیبوں کے اسلوب میں مکتوب نگاری کی گئی ہو، مثلاً مکاتیبِ خضر، مشاہیر کے خطوط، غالب کے نئے خطوط، عالمِ بالا سے غالب

* صدر شعبہ اردو اور مشرقی زبانیں، سرگودھا یونی ورسٹی، سرگودھا

کے خطوط وغیرہ۔

سوم، جن میں مکتوب نگار اپنی طرف سے کسی فرضی مکتوب الیہ کو مخاطب کرتا ہے۔ اس میں فرضی استفسارات کا جواب دیا جاتا ہے اور فرضی استفسارات کیے جاتے ہیں۔ ایسے خطوں میں غلام احمد پرویز کے لکھے ہوئے سلیم کے نام خطوط شامل ہیں۔

چہارم، جن میں مکتوب نگار کسی فرضی شخصیت کی طرف سے کسی فرضی مکتوب الیہ کو خط تحریر کرتے ہیں۔ ایسے مکتوب بالعموم فکشن نگاری میں شمار کیے جاسکتے ہیں، مثال کے طور پر سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ صحبتِ ناجنس، قاضی عبدالغفار کے تحریر کردہ **لیلیٰ کے خطوط**۔

فی الوقت پہلی قسم کی مکتوب نگاری پیشِ نظر ہے۔ ایسے مکتوب نگاروں میں ایم اسلم کی کتاب **خط کاجواب**، ابوالکلام آزاد کی **غبارِ خاطر**، مجنوں گورکھ پوری کے **پردیسی کے خطوط**، ڈاکٹر محمد باقر کے **لندنی دوست کے نام خطوط**، محمد یونس کے **قیدی کے خط**، سعادت حسن منٹو کے **اوپر نیچے اور درمیان** اور کشور ناہید کے **بُری عورت کے خطوط** شامل ہیں۔

○○○

ایم اسلم (۱۸۸۵ء- ۱۹۸۳ء) دو سو سے زائد ناولوں اور بیس افسانوی مجموعوں کے خالق ہیں، علاوہ ازیں شاعری اور مضمون نگاری سے بھی شغف رہا۔ ایم اسلم کے ایک مجموعۂ مکاتیب **خط کاجواب** میں آٹھ خط ایسے ہیں، جو کسی فرضی خاتون 'دخترِ اسلام' کو لکھے گئے ہیں اور ان کے پردے میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ان خطوں میں وہ سوانحی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی مسائل پر بحث کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کسی 'دخترِ اسلام' کے خطوں سے اقتباس دے کر اس کے جواب دیتے ہیں۔ یہ خطوط دراصل ایم اسلم کے وہ خیالات ہیں، جنھیں وہ اپنے ناولوں یا افسانوں میں جگہ نہ دے سکے، لیکن قارئین کے سامنے پیش کرنے کے متمنی تھے، چناں چہ انھوں نے ایک مکتوب الیہ کو خیال کر کے اس کی طرف سے ایم اسلم کے خیالات پر اعتراضات پیش کیے اور پھر ان کے مفصل جوابات تحریر کیے۔ چند دل چسپ مقامات سے کچھ سطور پیش کی جاتی ہیں:

> آپ کا ارشاد ہے، 'تعلیم تو بے شک ضروری ہے، لیکن یہ پردہ تو کچھ آؤٹ آف فیشن ہو گیا ہے، لیکن ہمارے ہاں تو وہی قید و بند کی رسم ہی چلی آتی ہے'۔ مبارک عرض کرتا ہوں کہ آپ کے ہاں قید و بند کی رسم ہے۔ تعلیم تو واقعی عورت کے لیے بہت ضروری ہے۔ مرد اگر جاہلِ مطلق رہیں تو کچھ ایسی بات نہیں، کیوں کہ مرد تعلیم یافتہ ہو کر بھی وہ وہ گل کھلا رہے ہیں کہ خدا پناہ میں رکھے۔ اب رہا پردہ، جو بقول آپ کے، 'آؤٹ آف

فیشن' ہو گیا ہے، گو آپ ابھی تک اسی قید و بند کی کڑیاں جھیل رہی ہیں اور میری تو خداے قدوس سے یہی دعا ہے کہ آپ تازیست اسی قید و بند میں رہیں۔[1]

اس کے بعد مکتوب نگار کی طرف سے اسی خط میں نہیں، بلکہ دوسرے، تیسرے خط کے بھی کئی صفحات اسی موضوع کے لیے مختص ہو گئے اور وہ مختلف دلائل و براہین سے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں گفتگو کرتے رہے۔ ان خطوں سے کہیں کہیں یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایم اسلم واعظ کی صورت اختیار کر گئے ہیں، چناں چہ ایسی گفتگو کسی نجی محفل کے لیے تو موزوں ہو، لیکن خطوں میں اس کا محل نہیں ہوتا۔ خطوں میں اشارتاً کسی موضوع پر بات ہو سکتی ہے، لیکن طویل مکالمے کی گنجائش نہیں ہوتی:

اگر واقعی وہی صورت پیدا ہو رہی ہے یا پیدا ہو چکی ہے، جس کا اظہار آپ نے اشارتاً ان دو اشعار میں کیا ہے اور آپ کو پریشانی ہو رہی ہے تو محترمہ! اس کا علاج ایک اَور بھی ہے۔ بڑا مجرب اور آزمودہ علاج۔ نماز پڑھا کیجیے اور قرآنِ حکیم کی ہر روز تلاوت کیا کیجیے۔ اللہ تبارک تعالیٰ خود قرآنِ حکیم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے دلوں کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ آزما تو دیکھیے ایک بار۔ ہمارا دین، ہماری دنیا سب اسلام اور قرآن کے ساتھ ہے، لیکن مصیبت ہے کہ ہم نے دنیا کی خاطر دین کو بھلا رکھا ہے۔ قرآن تو ہم سب لوگوں کے گھروں میں ایک چھوڑ، دو دو چار چار ہوں گے، لیکن محض تبرک کے طور پر رکھے ہوئے۔ دیکھیے، ناراض نہ ہو جایئے؛ فرمایئے تو، جس شوق سے آپ میرے افسانے پڑھتی ہیں، کبھی اس شوق سے آپ نے قرآنِ حکیم کی بھی تلاوت فرمائی۔[2]

یہ خیالات تو اُس دَور میں ہی نہیں، ہر دَور میں موجود رہے ہیں، لیکن اس میں کوئی حکیمانہ اندازِ نظر پیش کرنے کے بجاے عمومی گفتگو سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ادیب اور ایک دانش ور سے واعظانہ طریقِ کار کی نسبت لطافت کا مطالبہ کیا جاتا ہے، وہ ان خطوں سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ دو طالب علم باہم گفت و شنید میں مصروف ہیں۔ اس کی مثال دیگر موضوعات میں بھی ملتی ہے۔

○○○

ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء– ۱۹۵۸ء) اگست ۱۹۴۲ء میں پابندِ سلاسل ہوئے اور تین سال بعد رہائی پائی۔ اس دَوران میں انھیں خاصی فرصت تھی، جس میں وہ خطوط لکھتے رہے۔ محمد اجمل خاں نے غبارِ خاطر کی تعارفی تحریر میں اطلاع دی کہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہ تھی اور حضرت مولانا کی کوئی تحریر باہر نہیں جا سکتی تھی، اس لیے یہ مکاتیب وقتاً فوقتاً لکھے گئے اور ایک فائل میں جمع ہوتے رہے۔[3]

آزاد کے بقول یہ خط مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو لکھے گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آزاد اور مولانا شروانی کی دل چسپیوں کے میدان مختلف تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک کی زندگی ہنگاموں اور کش مکش میں گزری تو

دوسرا زندگی بھر گوشہ نشین رہا؛ اس کے باوجود دونوں میں باہمی محبت و اخلاص اور علم و ادب سے وابستگی نے ایک ایسا تعلق پیدا کر دیا تھا، جس کی خاطر آزاد قید کے دَوران میں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء تک، تقریباً تیرہ ماہ ان سے مخاطب رہے۔ اس مکاتبت کا سبب اس کے علاوہ اَور کچھ نہیں کہ مولانا کو مخاطب کر کے اپنی کیفیات، جذبات و احساسات، سوانحی و مذہبی اور تہذیبی و سیاسی حالات قلم بند کرتے گئے اور پھر ان تحریروں کو ایک مجموعے کی صورت مرتب کر کے شائع کر دیا۔ یہ خطوط کاہے کو ہیں، طویل طویل مضامین ہیں، جن کے آغاز میں 'صدیقِ مکرم' اور آخر میں 'ابوالکلام' لکھنے سے مکتوبات کا تاثر دیا گیا ہے، حتیٰ کہ خط نمبر ۹ اور آخری سات خطوں میں تو انھوں نے اپنا نام درج کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان خطوں میں، سوائے پہلے خط کے، 'صدیقِ مکرم' سے مراد حبیب الرحمٰن شروانی کے بجائے کسی دوسری شخصیت کو بھی قرار دیا جائے تو بھی ان خطوں کے مندرجات پر کچھ فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ ان میں وہ حقیقتاً کسی 'صدیقِ مکرم' سے مخاطب نہیں ہیں، بلکہ صرف اپنی بات کہہ رہے ہیں۔ عبدالقوی دسنوی ان تحریروں کو بہر صورت خطوط قرار دینے کے باوجود تسلیم کرتے ہیں:

> خطوط کا مکتوب الیہ کی نظر سے اشاعت سے پہلے نہ گزرنا، اشاعت میں عجلت سے کام لینا، پھر ابتدا میں اسے راز میں رکھنا، بعض خطوط میں طوالت، بعض خطوط میں مقالے کا رنگ، بعض خطوط میں مکتوب الیہ کی شخصیت کی دھندلی تصویر کا بھی نہ اُبھرنا اور صرف مکتوب نگار کا بھرپور شخصیت کے ساتھ جلوہ گر ہونا؛ یہ سب شبہ کو یقین کی طرف کھینچتے ہیں، چناں چہ عام فضا اس کتاب کو مجموعہ خطوط کہنے کے خلاف ہو گئی۔[۴]

خود آزاد نے ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء کے خط میں اپنی ان تحریروں کی نسبت لکھا ہے کہ 'کلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے'۔ اگرچہ انھیں یہ خبر نہیں کہ اُن حالات میں یہ 'خطوط' مکتوب الیہ تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں، تاہم وہ کیا کریں کہ 'افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ' سکتے، چناں چہ وہ اپنی حالت کو مرزا غالب کے اس مصرعے سے تعبیر کرتے ہیں، 'مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا'۔[۵]

مالک رام بھی انھیں خط تسلیم نہیں کرتے، بلکہ وہ انھیں متفرق مضامین قرار دیتے ہیں، لیکن ان تحریروں کو مضامین قرار دینے میں بھی انھیں تکلف ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کی مشکلات کا اندازہ لگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ دراصل چند متفرق مضامین ہیں، جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے، جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں تھا... لیکن وہ ان باتوں کو الگ الگ مضامین کی شکل میں بھی قلم بند نہیں کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ اس صورت میں باہمی تعلق کے فقدان کے باعث بعد کو انھیں ایک شیرازے میں یکجا کرنا آسان نہ ہوتا۔ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ انھیں کسی شخصِ واحد کے نام خطوں کی شکل میں مرتب کر دیا جائے۔ ان کے حلقہ احباب میں صرف ایک ہستی ایسی

تھی، جو علم کی مختلف اصناف میں یکساں طور پر دل چسپی لے سکتی تھی۔ یہ نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کی ذات تھی۔ انھوں [آزاد] نے عالمِ خیال میں انھیں [شروانی] کو مخاطب تصور کر لیا اور پھر جب کبھی، جو کچھ بھی ان کے خیال میں آتا گیا، اسے بے تکلف حوالہ قلم کرتے گئے۔[۶]

ان 'خطوں' کی دل چسپ بات یہ ہے کہ جیل سے رہائی کے بعد بھی مکتوب الیہ کو نہیں بھیجے گئے، بلکہ ان کی اشاعت کے بعد کتابی صورت میں ان کو پیش کیے؛ چناں چہ انھیں کسی طور پر خطوط کی صنف میں شامل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ کہنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد نے ایک مخاطب فرض کر کے چند متفرق تحریریں قلم بند کیں، جنھیں ایک مجموعے کی صورت یکجا کر دیا، البتہ کتابی صورت دیتے ہوئے انھیں خطوط کی شکل دے دی۔ ان خطوں میں کہیں روزنامچے کا احساس ہوتا ہے، کہیں سفرنامے کا، مثلاً:

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہو گی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلے پر دِکھائی دیا، پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اَب اُس دنیا میں، جو قلعے سے باہر ہے اور اس میں، جو قلعے کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا، چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجیے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے۔ خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا۔[۷]

کہیں مقالے کا، جن میں طویل طویل اور متعدد اقتباسات دیے گئے ہیں۔ وہ ایک موضوع پر گفتگو شروع کرتے ہیں اور پھر دلائل اور مثالوں سے اس کو طول دیتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کے خط میں چائے سے متعلق لکھتے لکھتے پورا خط بھر دیا اور آخر میں کہنے پر مجبور ہو گئے کہ 'صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہو گئی، مگر بائیس صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی'[۸] اور ۷ جنوری ۱۹۴۳ء کا خط آتش دان پر بات کرتے کرتے مکمل ہو گیا تو لکھا کہ 'بہرحال، جو بات کہنی چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اس ایک واقعے نے صبح کے معاملے کی پوری فضا بدل دی اور جُوے طبع افسردہ کا آبِ رفتہ پھر واپس آ گیا'۔[۹]

اس پر ان کا اسلوب اتنا شگفتہ کہ بعض اوقات جزئیات نگاری میں تجاوز کے باوجود تحریر قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے، بالخصوص ۱۷ مارچ ۱۹۴۳ء کا خط میں، جسے چڑیا چڑے کی کہانی کا نام دیا گیا، ایسی شگفتہ نگاری کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں۔[۱۰]

OOO

ایسے ہی پچیس خطوط محمد یونس سے بھی یادگار ہیں۔ محمد یونس پشاور کے رہائشی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ، خدائی خدمت گاروں کے کارکن، قیامِ پاکستان کے بعد نقل مکانی کر کے ہندوستان چلے گئے؛ جہاں وہ وزارتِ خارجہ میں اہم

عہدوں پر متمکن رہے، حتیٰ کہ الجزائر میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے۔**قیدی کے خط** 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے دَوران انھوں نے ۱۹۴۲ء– ۱۹۴۵ء تک پشاور، ڈیرہ اسماعیل خاں، ایبٹ آباد اور ہری پور کی جیلوں میں تحریر کیے۔ کرنل بشیر حسین زیدی کے بقول، **غبارِ خاطر** کی طرح یہ خط بھی کسی کو بھیجنے کے لیے نہیں، بلکہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور اپنی جیل اور جیل کے ساتھیوں کی دل بستگی کے لیے لکھے تھے'۔"خود مصنف لکھتے ہیں:

> میرے یہ خط عجیب نوعیت کے ہیں۔ اس نئے ماحول میں باہر کی زندگی کی لطافتوں سے محروم ہوں۔ نہ ہی زیادہ وقت گزرا ہے اور نہ ہی بہت دُور گیا ہوں، مگر یہ کم بخت دیواریں آسمان تک اونچی دکھائی دیتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مَیں کسی دوسری دنیا میں آبسا ہوں۔ یہ تحریر کب اور کون پڑھے گا، خدا ہی جانتا ہے۔ فی الحال تو انھیں یہیں بند رہنا ہے۔[۱۲]

یہ خط ذاتی احساسات و جذبات، قید کے ساتھیوں سے تعلقات، سیاسی معاملات اور دیگر موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ابتدائی خطوں میں محمد یونس نے اپنی گرفتاری تک کے سفر کی رُوداد بیان کرنے کے بعد جیل کے شب و روز کی مصروفیات تحریر کرنا شروع کیں:

> موت کا منظر یوں بھی دردناک ہوتا ہے، مگر یہاں تو صورت اتنی الم ناک ہو جاتی ہے کہ قلم لکھنے سے قاصر۔ اکثر بھائیوں کی آخری گھڑی رات کی آخری گھڑیوں میں ہی آئی۔ اگر کوئی قیدی جاگ رہا ہوتا تو وہ وارڈر[Warder] کو ایک ساتھی کے کم ہونے کی خبر کر دیتا، ورنہ صبح آنکھ کھلنے پر ہی پتا چلتا کہ ہم میں سے ایک کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔[۱۳]

ان خطوں کا بنیادی تعلق جیل کی یادداشتوں سے ہے؛ البتہ ان میں بعض مقامات پر ایسی شگفتگی بھی شامل ہو گئی ہے، جو بے باکی اور جرأتِ کردار سے متعلق ہے۔

> ڈسٹرکٹ جیلوں میں لمبی سزا والے قیدی نہیں رکھے جاتے، اس لیے یہ جگہ ان پاک ہستیوں سے محروم ہے۔ گاہے بہ گاہے بھولا بھٹکا آ ہی جاتا ہے اور پھر اس کی کرم فرمائیوں کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ ان میں ایک نے پوری بلّی کی خصلت پائی ہوئی ہے۔ باوجود ان قاعدے قانون، جن کی رُو سے قیدیوں کو جیل میں گھومنے کی اجازت نہیں، یہ ماسٹر سارا دِن ہَوا خوریوں میں ہی لگا رہتا ہے۔ اپنے ایک بزرگ سے نقب زنی تقریباً سیکھ کر اس کا دل دادہ ہو گیا اور اسی شغل کے طفیل قید بھی ہوا، مگر بڑے مزے سے کہتا ہے کہ چوری کا مال بڑی احتیاط سے چھوڑ آیا ہوں اور سات سال گزار کر پھر مزے کروں گا۔[۱۴]

اگر ان تحریروں کو خطوں کی صورت نہ دی جاتی تو انھیں روزنامچہ کی صورت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ محمد یونس نے بس یہ کی کہ ان تحریروں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے شروع میں مقام اور تاریخ درج کر دی، لیکن خط کے ایک اہم حصے، یعنی اختتامیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

OOO

مجنوں گورکھ پوری (۱۹۰۴ء – ۱۹۸۸ء) بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں، لیکن تحقیق، افسانہ اور ترجمے سے بھی انھیں شغف رہا ہے اور ان میدانوں میں بھی ان کی خدمات نمایاں رہی ہیں۔ **ادب اور زندگی**، **دوش و فردا**، **نقوش وافکار**، **نکاتِ مجنوں**، **تنقیدی حاشیے**، **اقبال اجمالی تبصرہ** جیسی کتب کے ساتھ ساتھ ان کے تنقیدی خیالات کو سمجھنے کے لیے **پردیسی کے خطوط** بھی کافی اہم ہے۔

پردیسی کے خطوط کی پہلی جلد ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی، جب کہ دوسری مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے ۱۹۶۱ء میں۔ دونوں جلدوں میں آٹھ آٹھ خط شامل ہیں۔ یہ کتاب بظاہر خطوط کا مجموعہ ہے، لیکن بقول شاہین فردوس، 'یہ خطوط تنقیدی مضامین کا مجموعہ کہے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، کیوں کہ ان خطوط میں زیادہ تر ادبی و علمی موضوعات کو شعوری طور پر اٹھایا گیا ہے'۔[۱۵] دراصل مجنوں نے ادب اور زندگی سے متعلق بعض مسائل پر اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ ان خطوں میں سے بعض میں انھوں نے 'پردیسی' کی طرف سے فرضی مرد عورتوں (منوہر، ناہید، گُلنار، یاسمین) کو مخاطب کیا۔ اپنے لیے لفظ 'پردیسی' کے استعمال کا جواز انھوں نے اپنے ساتویں خط کے اختتام پر دیا ہے:

> گُلنار! مَیں آج پورے آٹھ سال سے اپنے کو زندگی میں اجنبی پا رہا ہوں۔ دوستوں اور عزیزوں کی بھری دنیا میں بیگانہ ہو رہا ہوں اور کھویا کھویا سا رہتا ہوں۔ عرصہ سے جب کبھی کسی دوست کو خط لکھتا ہوں تو آخر میں 'پردیسی' کے نام سے دستخط کرتا ہوں۔[۱۶]

یہ تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں چھپتی رہیں، اس لیے لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ ایسے تنقیدی مباحث کے لیے خطوں کو ذریعہ کیوں بنایا گیا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> میرا عالم یہ تھا کہ زندگی اور ادب کے مختلف مسائل پر ذہن میں خیالات کی ایک طوفانی شورش تھی۔ ایک اندرونی تحریک کا تقاضا تھا کہ کچھ لکھوں، دوسری طرف مجھ میں اتنی تاب اور اتنا تحمل نہ تھا کہ نظم اور ترتیب کے ساتھ کسی مسئلہ پر کوئی باضابطہ مقالہ تیار کروں۔ سچ پوچھیے تو مستقل طور پر پردیسی کے خطوط لکھنے اور ان کو شائع کرانے کا خیال اُسی زمانہ میں پیدا ہوا۔[۱۷]

دو سو اٹھارہ صفحات پر محض آٹھ خط، یوں سمجھ لیجیے کہ ہر خط اوسطاً ستائیس ستائیس صفحات پر مشتمل؛ گویا یہ طویل مضامین پر مبنی ایک سلسلہ ہے، جسے خطوں کی صورت دے کر قارئین کے لیے شگفتہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور بعض مقامات پر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، لیکن جہاں بحث طویل ہو جاتی ہے، خط کا تاثر زائل ہو جاتا ہے اور قاری لاشعوری طور پر اسے مضمون کی حیثیت دینے لگتا ہے، لیکن ایسے میں اچانک وہ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے قاری کو صحرا سے گلستان میں لے آتے ہیں۔ پہلے خط کا دوسرا صفحہ ملاحظہ کیجیے:

> پیاری ناہید! یہ خیال میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے کہ تم نے میری راہ کھوٹی کی اور مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ مَیں آگے بڑھ کر اپنی آخری منزل پر پہنچتا اور اپنے کاندھے سے بارِ سفر اُتار کر اطمینان کا سانس لیتا۔ مَیں اس 'حرفِ نازک' کی زیادہ تشریح کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا مجھے کہہ لینے ہی دو کہ تم نے اچانک راستے میں ڈاکا ڈالا اور مجھے بُری طرح غارت کیا اور مجھے زخموں سے چُور کر کے چھوڑ دیا۔[18]

مکتوب الیہ سے ذاتی و جذباتی گفتگو کا دورانیہ اتنا ضرور ہوتا ہے کہ قاری یہ بھول جاتا ہے کہ مجنوں کوئی تنقیدی مسائل بھی چھیڑنا چاہتے ہیں، لیکن جب کئی صفحات کے بعد وہ گریز کی طرف آتے ہیں تو قاری تمہید کے سہارے اسے بھی گوارا کر لیتا ہے۔ دوسرے خط سے گریز کا انداز دیکھیے:

> تم لکھتی ہو کہ تم نے مجھ کو اپنی تخیل بنالی ہے اور میرے خیال میں زندگی گزار دینا اور زندگی بھر میرے اشاروں پر چلنا تمہاری زندگی کا ایک ایسا مقصد ہے، جو اس کی اندرونی ترکیب میں داخل ہے۔ یہ سن کر مجھے اتنی مسرت نہیں ہوئی، جتنی کہ ہونی چاہیے، اس لیے کہ اندیشہ ہے کہ ایک بڑھتی اور پروان چڑھتی ہوئی زندگی کہیں گھُٹ کر فنا نہ ہو جائے۔ تم نے جگر مرادآبادی کا جو شعر لکھا ہے، آج مجھے اس میں ایک تازہ لذت ملی، ورنہ شعر بہت معمولی ہے:
>
> تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ملی
> وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی
>
> ...مجھے جگر کی اسی غزل کا ایک دوسرا شعر یاد آ گیا:
>
> اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
> کہ ہم نے آہ تو کی، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی[19]

اس کے بعد جگر مرادآبادی سے متعلق باقاعدہ تنقیدی مباحث چھڑ جاتے ہیں اور اس قدر طول کھینچتے ہیں کہ وہ ایک باقاعدہ ایک مقالہ بن جاتا ہے۔ تیسرے خط میں اپنی بیوی اور بچوں سے اپنی محبت کی بابت گفتگو کرتے کرتے وہ ناہید کو محبت کے بارے میں بتانے لگتے ہیں:

پرسوں، جب مَیں تم کو خط روانہ کر چکا تو بڑی دیر تک اپنی اور تمھاری دوستی اور محبت اور اس کی تقدیر اور غایب کے بارے میں سوچتا رہا اور اس سلسلہ میں بہت کچھ غور کر ڈالا۔ ناہید! محبت ہے کیا، کبھی اس سوال کو بھی اپنے ذہن میں اٹھایا ہے؟[20]

اور پھر بتاتے ہی چلے جاتے ہیں، لیکن ماحول کو رومانی رکھنے اور اپنے اسلوب کی چاشنی بر قرار رکھنے کے لیے جو شعوری کوشش کی ہے، بظاہر وہ اس میں کامیاب دِکھائی دیتے ہیں۔ چوتھے خط میں وہ قومیت و وطنیت کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کرتے کرتے جب اختتامِ خط کی طرف بڑھتے ہیں تو پھر سے مکتوب الیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور متعلقہ موضوع کو مکتوب الیہ کی دل چسپی سے جوڑ دیتے ہیں:

ناہید! اب کہاں تک لکھوں۔ مَیں کہہ چکا ہوں کہ وطن کی محبت انسان کا بہت بھولا اور نفس کو مہذب بنانے والا جذبہ ہے۔ جس شخص کے دل میں اپنے گھر کی محبت نہیں، وہ آدمی نہیں؛ لیکن ایک کے ساتھ محبت کے معنی دوسرے کے ساتھ نفرت کے نہیں ہیں۔ جو محبت دوسروں کے ساتھ نفرت کیے بغیر زندہ نہ رہ سکے، وہ اعتبار کے قابل نہیں۔[21]

اس مکتوب نگاری میں انھوں نے حالاتِ حاضرہ سے متعلق بھی بعض ایسے جملے تحریر کر دیے ہیں، جن سے قاری ماضی، حال مستقبل میں سے کسی سے بے نیاز نہیں رہتا، بلکہ وہ سنجیدہ تنقیدی تحریر کے مطالعے کے دَوران میں کسی بیزار لمحے سے دوچار نہیں ہوتا۔ آٹھویں خط سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے، جو برِ عظیم کی سیاست میں آج بھی صادق آتا ہے:

قدیم ترین زمانے سے لے کر اس وقت تک ہندوستان کے اکابر میں بُدھ سے زیادہ مَیں کسی کی شخصیت کی عظمت اور برگزیدگی کا قائل نہیں ہوا۔ بڑی بے ریا اور طہارتوں سے معمور ہستی تھی، لیکن اب مَیں سوچنے لگا ہوں کہ اگر گوتم بُدھ کو وہ زمانہ ملا ہوتا، جو ہم کو ملا ہے تو کیا اُس کی وہی روحانی تسلی اور راحت میسر ہو سکتی تھی، جو ہوئی اور جس کی اُس نے ترغیب و تلقین کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج اُس کے لیے یہ امر ناممکن ہوتا اور اگر وہ زمانے سے بغاوت کر کے زبردستی شرافتِ نفس کی وہی تعلیم دیتا، جو اس کی انسانی فطرت کا تقاضا تھی اور جس کو آج کی دنیا کسی طرح قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو شاید اس کا بھی وہی حشر ہوتا، جو گاندھی جی کا ہوا۔[22]

اگرچہ مجنوں گورکھ پوری نے اپنے خیالات کو قلم بند کرنے کے لیے خطوں کا پیرایہ اختیار کیا، لیکن مکتوب نگاری کے جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مضامین کو کسی حد تک نرم کر کے خطوط کے دائرے کو توسیع دے کر دونوں کو باہم یوں ملا دیا ہے کہ اب یہ تحریریں ایک طرف خطوط تسلیم کیے جا سکتے ہیں تو دوسری جانب اپنے مندرجات کی بدولت اپنی اپنی جگہ ہر خط ایک خاص موضوع پر سنجیدہ مضمون بھی۔

OOO

ڈاکٹر محمد باقر (۱۹۱۰ء– ۱۹۹۳ء) پنجابی، اردو اور فارسی کے نام ور محقق، نقاد اور افسانہ نگار ہیں اور وہ پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں صدرِ شعبہ فارسی کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ ان کی تصانیف میں **اردوے قدیم**، **احوال و آثارِ اقبال**، **لندن سے خطوط** اور **لندنی دوست کے نام خطوط** قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر کی یہ کتاب **لندنی دوست کے نام خطوط** ۱۹۴۶ء میں مکتبہ علم و ادب لاہور سے شائع ہوئی۔ مصنف نے فہرست یا ترتیب کی جگہ 'خطوط کی فہرست' تحریر کیا ہے، لیکن نیچے نمبر شمار کے بعد لفظ 'مضمون' لکھ دیا ہے، جس سے قاری کو دھچکا محسوس ہوتا ہے کہ اوپر 'خطوط' کی فہرست کا عندیہ دے کر نیچے 'مضمون' کی اطلاع بہم پہنچائی گئی ہے، یا خدا! یہ خطوط ہیں یا مضامین۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر نے ان دونوں اصناف کو یوں ملا دیا ہے کہ کسی ایک صنفِ ادب سے متعلق فیصلہ کرنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ ۱۰۴ صفحات میں چھے خطوط شامل ہیں، یوں اوسطاً ہر خط کم و بیش سترہ صفحات پر مشتمل ہے اور مصنف نے ہر خط کے آغاز میں اس کا عنوان بھی درج کیا ہے۔ 'ایک خط'، 'ذہنیت'، 'سیاست'، 'طالب علم'، 'بھوک' اور 'ریاکاری' کے تحت لکھے گئے خط القاب و تسلیمات اور اختتامیے سے یکسر عاری ہیں۔ البتہ تحریر کے آخر میں تاریخ کے اندراج کا التزام کیا گیا ہے، جس سے یہ تحریریں کسی قدر خط کے قریب ہو جاتی ہیں۔ البتہ تحریر کا انداز و اسلوب انھیں مکاتیب کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔ یہ تحریریں زیادہ تر سیاسی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کر رہی ہیں، جس کے پڑھنے سے اُس دَور کے ہندوستان کے حالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ چند خطوں سے اقتباس دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلے خط کا ابتدائیہ ملاحظہ ہو:

> تم پوچھتے ہو، ہندوستان کی کیا حالت ہے؟ تم نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔ مسلم لیگ، پاکستان، خاکسار، فوجی بھرتی، کانگریس کا رویہ اور خدا جانے کتنی باتوں کا خیال بیک وقت تمھارے ذہن میں آیا۔ تم چاہتے ہو، موجودہ ہندوستان کی ایک مکمل تاریخ تمھیں لکھ کر بھیج دوں۔ میری بھی خواہش یہ ہے کہ تمھارے شوقِ تجسس کی تسکین ہو، لیکن اتنی فرصت کہاں سے لاؤں؟[۲۳]

> خالدہ کے الفاظ مجھے بار بار محسوس کرا رہے تھے کہ میرا کوئی وطن نہیں، میری کوئی قوم نہیں۔ قوم اور وطن کے تصور کے ساتھ جو آسودگیاں اور تحفظ دوسرے ممالک میں انسان محسوس کرتا ہے، وہ یہاں بالکل مفقود تھے۔ مَیں سوچنے کے باوجود کوئی دو آدمی ایسے جمع نہ کر سکا، جو اپنے آپ کو ہم قوم کہتے ہوئے اپنے سامنے ایک ہی مقصدِ زندگی بھی رکھتے ہوں، مقصدِ زندگی تو خیر بڑی چیز ہے، کوئی دو آدمی ایسے بھی ذہن میں نہ آئے، جو ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہوں۔[۲۴]

> مہتمم کی تقریر ختم ہونے پر تالیوں نے سائبان کے پردے ہلا دیے اور مس... ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ صدر کی اجازت سے تقریر فرمانے لگیں۔ صدر، جو ابھی تک اونگھ رہے تھے، یکا یک جاگ اٹھے۔ یہ مس...

کی جارجٹ کی ساری کی سرسراہٹ کا اثر تھا یا ان کے معطر جسم سے ہَوا میں پھیلنے والی عطر کی لپٹوں کا کرشمہ تھا کہ صدر ان کی تقریر کے درمیان ایک لمحہ کے لیے بھی نہ اونگھے، بلکہ سارا عرصہ ان کی طرف تکتے رہے۔[۲۵]

○○○

سعادت حسن منٹو ایک ایسا افسانہ نگار ہے، جسے اپنی زندگی میں بھی اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا اور موت کے بعد بھی؛ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ان کے موضوعات پر اعتراض کرتے ہیں، وہ بھی اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ افسانہ نگاری کے علاوہ ان کے خاکے بھی خاصے کی چیز ہیں، لیکن یہاں ہم ان کے اُن فرضی خطوط پر بات کریں گے، جو انھوں نے 'چچا سام' کو لکھے۔ ان کے ایک مجموعے **اوپر نیچے اور درمیان** میں اٹھارہ مضامین اور ایک افسانوں کے علاوہ 'چچا سام' کے نام نو خطوط بھی شامل ہیں۔ یہ خط ۱۶ دسمبر ۱۹۵۲ء سے ۲۶ اپریل ۱۹۵۴ء کے درمیان لکھے گئے۔

منٹو نے یہ خطوط ہلکے پھلکے انداز میں لکھے ہیں، لیکن وہ باتوں باتوں میں ایسی انوکھی اور سنجیدہ بات کہہ جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، مثلاً درج ذیل پیراگراف کو دیکھیے:

میرا ملک ہندوستان سے کٹ کر کیوں بنا، کیسے آزاد ہوا، یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے؛ یہی وجہ ہے کہ مَیں خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، کیوں جس طرح میرا ملک کٹ کر آزاد ہوا، اسی طرح مَیں کٹ کر آزاد ہوا ہوں اور چچا جان! یہ بات تو آپ جیسے ہمہ دانِ عالم سے چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے کہ جس پرندے کو پَر کاٹ کر آزاد کیا جائے گا، اس کی آزادی کیسی ہو گی۔[۲۶]

منٹو کی بصیرت کی داد دینا پڑتی ہے، جب وہ ایک ایسی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جو ان کے خط کے تقریباً تیئیس برس بعد پیدا ہوتی ہے۔ منٹو لکھتے ہیں:

ہندوستان لاکھ ٹاپا کرے، آپ پاکستان سے فوجی امداد کا معاہدہ ضرور کریں گے، اس لیے کہ آپ کو اس دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے استحکام کی بہت زیادہ فکر ہے اور کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہاں کا مُلّا روس کے کمیونزم کا بہترین توڑ ہے۔ فوجی امداد کا سلسلہ شروع ہو گیا تو آپ سب سے پہلے ان مُلّاؤں کو مسلح کیجیے گا۔[۲۷]

اور پھر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی مداخلت کے بعد ہماری حکومت نے امریکی امداد کو جس طرح استعمال کیا، وہ ان جملوں میں منٹو بیان کر چکے تھے، لیکن کون جانتا تھا کہ اس فیصلے کے نتیجے میں وطنِ عزیز آئندہ پچاس برس تک آگ کے شعلوں اور خون ریزی کا سامنا کرے گا۔

برعظیم کی تحریکِ آزادی کے ثمرات حاصل ہونے کے بجائے یہاں کے عوام نے جان و مال اور عزت و آبرو کی قربانی کے بعد دو الگ الگ ملک حاصل کیے، لیکن سامراج نے جاتے جاتے ان میں ایک ایسا فتنہ پیدا کر دیا کہ ان

کے مابین کبھی امن و آشتی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ صورتِ حال ۱۹۴۷ء سے تاحال جاری ہے اور نجانے کب تک برقرار رہے۔ منٹو نے اس کی بنیادی وجہ ایک خط میں بیان کر دی تھی:

> ہمارے ساتھ فوجی امداد کا معاہدہ بڑے معرکے کی چیز ہے، اس پر قائم رہیے گا۔ اِدھر ہندوستان کے ساتھ بھی ایسا ہی رشتہ استوار کر لیجیے، دونوں کو پرانے ہتھیار بھیجیے، کیوں کہ اب تو آپ نے وہ تمام ہتھیار کنڈم کر دیے ہوں گے، جو آپ نے پچھلی جنگ میں استعمال کیے تھے۔ آپ کا یہ فالتو اسلحہ ٹھکانے لگ جائے گا اور آپ کے کارخانے بے کار نہیں رہیں گے۔[۲۸]

OOO

معروف شاعرہ اور ادیبہ کشور ناہید نے **بُری عورت کے خطوط** کے نام سے اپنی نازائیدہ بیٹی کو مخاطب کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل کشور ناہید کے اُن خیالات پر مشتمل ہے، جو انھوں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں زندگی سے متعلق مرتب کیے ہیں۔ قریبی رشتوں، محلے کے بزرگوں، تعلیمی اداروں کے مرد ملازموں، دفتری کارندوں، اعلیٰ افسروں، ادبی و علمی حلقوں، شوہر کے دوستوں اور اپنے واقف کار مردوں کی طرف سے اختیار کیے گئے رویوں کے زیرِ اثر اپنی بپتا بیان کرنے کے لیے کشور ناہید نے اپنی نازائیدہ بیٹی سے مکالمے کا سہارا لیا ہے۔ وہ ساری باتیں، جو ان کی خود کلامی ہے اور وہ بحیثیت عورت کسی مرد یا اجنبی عورت سے کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتی تھیں، اپنی نازائیدہ بیٹی سے بیان کر دیں۔ بعض مقامات پر کشور نے اپنی بیٹی کی طرف سے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اپنی بعض کیفیات اور جذبات کو قلم بند کیا ہے اور بعض جگہوں پر بیٹی کو سمجھانے کی خاطر اپنی ناگوار اور ناگفتنی احساسات تحریر کیے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اُس وقت سے خوف زدہ دِکھائی دیتی ہیں کہ اگر بیٹی ہوتی تو خود ماں کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا۔ غرض یہ تحریریں، جو خود کلامی سے مملو ہیں، کشور ناہید کی خود نوشت کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اگرچہ کتاب کے نام میں لفظ 'خطوط' شامل ہے، لیکن اس میں شامل تحریروں کو عنوانات دیے گئے ہیں، جن سے یہ تحریریں مضامین یا انشائیوں کے مشابہہ ہو گئی ہیں۔ چھبیس تحریروں میں سے کسی میں القاب و آداب، تمہید یا اختتامیہ نہیں، جس کی وجہ سے انھیں خط کہنا مشکل ہو جاتا ہے؛ لیکن اگر عنوانات کو نظر انداز کر دیا جائے اور القاب و اختتامیہ کو شامل کر دیا جائے تو بلاشبہ یہ مکتوب کی بہترین صورت قرار پاتی ہے۔ اپنی نازائیدہ بیٹی سے کہتی ہیں:

> تم پیدا ہو جاتیں تو مَیں اُن ساری عورتوں کو اپنے اندر کیسے پالتی، جو آج تک الگ الگ شخصیات ہیں۔ کوئی شاعر ہے، کوئی دفتری بابو ہے، کوئی ڈپلومیٹ ہے، کوئی گھرداری والی عورت ہے، کوئی رضاکارانہ کام کرنے

والی ہے، کوئی سب عورتوں سب مردوں کی دوست ہے؛ پھر تو مَیں تمھاری عصمت، تمھارے بدن، تمھارے نام، تمھارے ایک ایک لمحے کے تحفظ کی خاطر دربند ایک خاتون ہوتی۔ منھ بسور کر گھر میں رہنے والی یا مرد کو رجھا کر زندگی کرنے والی۔[۲۹]

ان خطوں میں بعض مقامات پر وہ اس قدر اقتباسات دیتی ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ وہ کوئی خط لکھنے کے موڈ میں ہے، بلکہ وہ تحریریں سنجیدہ مضامین کا رنگ بھر لیتی ہیں۔ 'ادھورے سچ کے بیچ' میں کشور نے ولیم میکس ویل، مرلے براؤن، مان ٹین، ایل بی سیبک، ایلیس ٹکلا، گریٹوڈسٹین، پکاسو، براک، ماتین، فریڈرک ہوف مین، اینڈرسن، رچرڈرائٹ، میری میکارتھی، عصمت چغتائی، فٹزجیرلڈ، کافکا، للین ہیلمن، امرتا پریتم، فرینکلن کی تحریروں سے اقتباس پیش کیے ہیں۔ بعض خیالات کی تکرار سے کتاب کے مجموعی تاثر پر حرف آتا ہے؛ البتہ اس کے اکثر پیراگراف کا آغاز 'تم پیدا ہوتیں تو دیکھتیں' یا 'تم پیدا ہوتیں تو کہتیں' یا 'تم پیدا ہوتیں تو پوچھتیں' یا 'تم ہوتیں تو' سے ہوتا ہے، لیکن اس تکرار نے ان خطوط میں بجائے بے لطفی کے، ایک خاص طرح کی شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ کشور اس تکرار کے ساتھ عورت کی مختلف کیفیات و احساسات بیان کرتی ہیں، مثلاً:

اگر تم پیدا ہو جاتیں تو کیا تم بھی اپنی ماں کے بارے میں باتیں سن کر غصے میں آجاتیں کہ ماں کو حکم دیتیں کہ آپ گھر پہ بیٹھیں، لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ تم پیدا ہوتیں تو اس بات پہ پریشان ہوتیں کہ آخر خاندان والوں کو تمھاری ماں پر فخر کیوں نہیں ہوتا، جب کہ دنیا کی ہر دوسری شخصیت کا تمھاری ماں سے رابطہ ہے۔ مَیں نے ویسے بہت شکر ادا کیا ہے تم پیدا نہیں ہوئیں۔ مَیں نے بہت سی ناموروں کی بیٹیوں کو اپنی ماں سے خائف اور کہیں کہیں تو نفرت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے، مقابلہ کرتے دیکھا ہے، ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر ماں کی سہیلیوں کے گھر رہتے دیکھا ہے۔[۳۰]

اس کتاب کے ذریعے کشور ناہید نے زندگی کے بعض تاریک گوشوں کو منور کرنے کی کوشش کی ہے اور بیسیوں ناگفتنی باتوں کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ وہ باتیں، جو معاشرے کی بند فضا میں ناموزوں محسوس ہوتی ہیں، ان پر اظہارِ خیال کے لیے کشور ناہید کی طرف سے جراَتِ اظہار سے بعض پیشانیوں پر تیوریاں بھی چڑھی ہوں تو جائز ہیں، لیکن ان کے اکثر اظہارات پر غور و فکر سے سماج کی تصویر کے جو رنگ نمایاں ہوتے ہیں، ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، مثلاً:

تم پیدا ہوتیں اور ماں کے رنڈاپے پہ شاید یہ تو کہہ سکتی تھیں، 'ماں! یوں زندگی مت گزارو، تمھیں کوئی ملے تو شادی کر لو، زندگی کے ساتھی کو تلاش کر لو'؛ البتہ بیٹوں کو یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ ماں کہیں کسی سے شادی نہ کر لے۔ نہ معلوم کیوں، احساسِ ملکیت چھن جانے کے خوف سے کہ باپ کی ملکیت میں کمی آنے کے خوف سے۔ یہ بھی نہیں کہ ماں کو باپ کے مرنے کے بعد بڑے لاڈ پیار سے رکھا ہو، یہ بھی نہیں کہ ماں کی کفالت

اور آسائش کے لیے ہر ماہ پیسے بھیجے ہوں، یہ بھی نہیں کہ کبھی پوچھا ہو، 'ماں! تمھیں کچھ تو نہیں'۔ بس، اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ نظر رکھے رہے کہ ماں کہیں کسی مرد سے دوستی نہ کر لے۔[۳۱]

○○○

مضامین یا دیگر اصنافِ نثر کے لیے مکتوباتی اندازِ تحریر اپنے اندر ایک دل کشی رکھتا ہے، لیکن مذکورہ بالا مجموعوں کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس روش کو اپنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس سلسلے میں جس اندازِ فکر و نظر اور جس شگفتگی اور بے ساختگی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے، وہ ہر ادیب کو ودیعت نہیں ہوتا، چناں چہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ایم اسلم، ڈاکٹر محمد باقر یا محمد یونس سے قطع نظر معروف نقاد مجنوں گورکھ پوری کے فرضی مکتوبات بھی وقت کے گرد میں دَب کر رہ گئے ہیں؛ البتہ سعادت حسن منٹو کی تحریریں اپنی بے ساختگی اور شگفتگی کی بِنا پر آج بھی اپنی تاثیر برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ کشور ناہید کے مکتوباتی جذبات و تاثرات اور خیالات و کیفیات میں کسی حد تک جان ہے، لیکن ان میں در آنے والی بِلاضرورت سنجیدگی نے انھیں بوجھل بنا دیا ہے؛ البتہ ابوالکلام آزاد کے خطوط اپنی پہلی اشاعت سے اب تک اپنا جواز فراہم کر رہے ہیں۔ وہ ایک طرف اسلوب کی سطح پر اپنی انفرادیت تسلیم کرانے میں کامیاب رہے ہیں اور دوسری جانب اپنے نفسِ مضمون کے سبب بھی قاری کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ فرضی مکتوبات اردو زبان و ادب کا ایسا سرمایہ ہیں، جو انشاپردازی کے ساتھ ساتھ اپنے مندرجات کے اعتبار سے بھی مؤرخینِ زبان و ادبِ اردو کی توجہ کا مرکز رہیں گے اور اردو ادبا کو اس طرزِ نگارش کی طرف دعوت دیتے رہیں گے۔

حوالہ جات:

۱۔ ایم اسلم:**خط کا جواب**،لاہور: دارالبلاغ، س ن، ص ۲۵
۲۔ ایضاً، ص ۵۷
۳۔ ابوالکلام آزاد:**غبارِ خاطر**، دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۶ء؟، ص ۵
۴۔ عبدالقوی دسنوی:**مطالعہ غبارِخاطر**، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۶۶
۵۔ ابوالکلام آزاد:**غبارِ خاطر**، ص ۱۸
۶۔ مالک رام: مقدمہ **غبارِخاطر**، نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۱ء، ص ۶
۷۔ ابوالکلام آزاد:**غبارِ خاطر**، ص ۱۳
۸۔ ایضاً، ص ۱۹۱
۹۔ ایضاً، ص ۳۰۳
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ محمد یونس:**قیدی کے خط**، نئی دہلی: ویریندر پریس، دوم ۱۹۸۴ء، ص ۲۶

۱۲۔ ایضاً، ص۲۹
۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۹
۱۴۔ ایضاً، ص۱۵۰
۱۵۔ شاہین فردوس:مجنوں گورکھپوری، حیات اور ادبی خدمات، ص۲۴۷
۱۶۔ مجنوں گورکھپوری:**پردیسی کے خطوط** (اوّل)، لکھنؤ:ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۵۷ء، ص۱۸۴
۱۷۔ ایضاً، ص۱
۱۸۔ ایضاً، ص۸
۱۹۔ ایضاً، ص۳۱
۲۰۔ ایضاً، ص۵۳
۲۱۔ ایضاً، ص۸۰
۲۲۔ ایضاً، ص۱۹۱
۲۳۔ محمد باقر، ڈاکٹر:**لندنی دوست کے نام خطوط**، لاہور:مکتبہ علم و ادب، ۱۹۴۶ء، ص۵
۲۴۔ ایضاً، ص۴۰ – ۴۱
۲۵۔ ایضاً، ص۹۹
۲۶۔ سعادت حسن منٹو:**اوپر نیچے اور درمیان**، لاہور: گوشۂ ادب، ۱۹۸۴ء، ص۱۵۵-۱۵۶
۲۷۔ ایضاً، ص۲۰۹-۲۱۰
۲۸۔ ایضاً، ص۲۰۰
۲۹۔ کشور ناہید:**بُری عورت کے خطوط**، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص۱۳
۳۰۔ ایضاً، ص۱۲۰
۳۱۔ ایضاً، ص۹۶

کتابیات:

۱۔ ابوالکلام آزاد:**غبارِ خاطر**، دہلی:حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۶ء
۲۔ اسلم، ایم:**خط کا جواب**، لاہور: دارالبلاغ، س ن
۳۔ سعادت حسن منٹو:**اوپر، نیچے اور درمیان**، لاہور: گوشۂ ادب، ۱۹۸۴ء
۴۔ شاہین فردوس:**مجنوں گورکھ پوری**، حیات اور ادبی خدمات، س ن
۵۔ عبدالقوی دسنوی:**مطالعہ غبارِخاطر**، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء
۶۔ کشور ناہید: **بُری عورت کے خطوط نازائیدہ بیٹی کے نام**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء
۷۔ محمد باقر، ڈاکٹر:**لندنی دوست کے نام خطوط**، لاہور: مکتبہ علم و ادب، ۱۹۴۶ء
۸۔ مالک رام: مقدمہ **غبارِخاطر**، نئی دہلی: ساہتیہ اکیڈمی، ۱۹۹۱ء
۹۔ مجنوں گورکھ پوری:**پردیسی کے خطوط**(اوّل)، لکھنؤ:ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۷ء
۱۰۔ مجنوں گورکھ پوری:**پردیسی کے خطوط** (دوم)، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۶۱ء
۱۱۔ محمد ایاز راہی:**یادوں کے بستی**، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء
۱۲۔ محمد یونس:**قیدی کے خط**، نئی دہلی: ویرندر پریس، دوم ۱۹۸۴ء

Abstract

This article attempts to discuss the varying nature of letters written by many known Urdu writers and poets for which letter writers had no visible and certain recipients in their minds. In doing so, these imaginary essay-like letters were divided into four types. It dispels sweeping generalization about the types of Urdu literary letters by scholars and writers of literary genres. It also finds information and issues which the writers did not share in their frequent writings for which he or she is known for. Citing examples of the Urdu imaginary letters, excerpts have been included from Abul Kalam Azad in Ghubar-e Khatir, M Aslam in Khat ka jawab, Muhammad Yonus in Qaidi ke khutoot, Majnoo Gorakhpuri in Perdesi ke khutoot, Dr Muhammad Baqir in Landani dost ke naam khutoot and Kishwar Naheed in Buri aurat ke khutoot.

Keywords: Imaginary Urdu letters, essay-like letters.